''تفہیم القرآن'' کے اسلوب کا تجزیاتی مطالعہ

*محمد جاوید اصغر

Abstract

"Tafseer-a-Quran" has been a very important matter of discussion of the Muslim scholars. And this height and achievement of learning relating to the interpretation of the Holy Quran on the part of the Muslim scholars is unique, unparalleled and matchless as compared with the western scholars/civilizations of the world. In fact "Tafseer-a-Quran" is the thought provoking mirror which reflects the ideas, theories and views of every epoch and era.

The interpretation of the Holy Quran started in the period of "Sahaba-Karam" and with the passage of time it grew and developed. "Tafseer" was defined under two perspectives. One is "Tafseer" by tradition while the other is "Tafseer" by opinion. Both the school of thoughts wrote down "Tafseer" according to their own theories and approach.

This "Tafseer" is replete with the following good qualities which highlight its importance and significance in the Tafseeri literature of urdu. Philosophy, diction, comparative study of other religions/theories, law, the logical, Historical insight, criticism on western thoughts, simplicity of prose and fluency of language are the salient features of this inspiring and dynamic "Tafseer of Maudoodi".

تفسیر قرآن مسلمان اہل علم کا اہم موضوع رہا ہے اسی لیے ہر دور اور ہر علاقے کے اہل قلم نے قرآن پاک کی تفاسیر لکھی ہیں۔ اور یہ مسلمانوں کا ایسا علمی کارنامہ ہے جس کی مثال کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔ تفسیر قرآن مسلمانوں کی فکر کا وہ آئینہ ہے جس میں ہر دور کے فکری رجحانات، نظریات وتحریکات اور اشکالات کا عکس نظر

*لیکچرار شعبہ اردو گورنمنٹ کالج جہانیاں ضلع خانیوال

آ تا ہے۔اس اعتبار سے یہ تفسیری ادب جہاں مسلمانوں کی فکر کا بہترین مظہر ہے وہاں قرآن سے متصادم نظریات کی تنقیح کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

تفسیر کا لفظ فَسر سے ہے، جس کے معنی توضیح وتشریح کرنا یا کھول کر بیان کرنا ہے۔فَسر بے حجاب کرنے کو بھی کہتے ہیں اور لفظ تفسیر کو پنہاں معنی کے اظہار وکشف سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔مسلمانوں کے تدوین وترجمہ کے دور میں لفظ تفسیر کا اطلاق مختلف علمی مسائل کی تشریح اور تفصیلات کے لیے کیا جاتا تھا، لیکن جوں جوں دینی علوم مختلف انواع میں تقسیم ہوئے تو لفظ تفسیر قرآن پاک کی توضیح وتشریح کے لیے ایک باقاعدہ اصطلاح بن گیا۔گویا تفسیر سے اب ایسا علم مراد لیا جانے لگا جو بشری استطاعت کی حد تک قرآنی آیات کے اس مفہوم کو بیان کرتا ہے۔جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب تھا۔امام ماتریدی کے مطابق: ''تفسیر کے معنی قطعیت کے ساتھ یہ کہنا کہ اس لفظ کے یہی معنی ہیں اور خداوند کریم نے یہی مفہوم مراد لیا ہے۔اس میں قطعیت اور یقین کا ہونا ضروری ہے''۔[1] ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلام الٰہی کے مفاہیم، اسباب نزول اور قرآنی الفاظ کی وضاحت اور صراحت اللہ کے منشا و مرضی کے مطابق کرنا ہی تفسیر ہے۔ ابو حبان کا قول ہے: ''تفسیر ایسے علم سے تعبیر ہے جن میں الفاظ قرآن سے بحث کی جائے''۔[2] یعنی تفسیر سے مراد محض قرآنی احکامات کی تشریح نہیں بلکہ ان آیات واحکامات کے اسباب نزول کی دلالت سے بحث کرنا بھی تفسیر کے ذیل میں آتا ہے۔

قرآن کریم کے احکامات بڑے واضح ہیں۔اس نے توحید، معاد، مکارم اخلاق اور تاریخ امم کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور جہاں کہیں اشکال پیدا ہوا بھی ہے قرآن نے اس کی صراحت کسی دوسری جگہ پیش کر دی ہے۔

قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور اس کے اوّلین مخاطب بھی عرب ہی تھے لیکن اس کے باوجود صحابہ کرامؓ کو بعض قرآنی احکامات کی تفسیر اور تشریح کے لیے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روشنی حاصل کرنا پڑتی تھی۔یوں سب سے پہلے مفسر قرآن حضور اکرم ﷺ ہی تھے۔آپ کا عمل وکردار اور سنن وعادات سبھی کچھ قرآن پاک کی تفسیر ہی ہے۔

آپ ﷺ نے قرآن کے تمام موضوعات کی اپنے قول وعمل سے وضاحت کر دی۔

آپ ﷺ کے بعد جب نئے تقاضے ابھرے تو آپؐ کے جانثار صحابہؓ نے نہایت خلوص اور سنجیدگی کے

ساتھ قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی اور اس سلسلے میں حد درجہ احتیاط برتی یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا "کون سی زمین مجھے اٹھائے گی اور کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اگر میں اللہ کی کتاب کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دوں جس کا مجھے صحیح علم نہیں[3]۔ لیکن اس قدر احتیاط کے ساتھ ساتھ اس دور میں بھی تفسیر قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ تاہم اس دور میں قرآن کی پوری تفسیر نہیں لکھی گئی صرف ان آیات کی وضاحت کی گئی جس میں اشکال پایا جاتا تھا۔ عہد صحابہ میں تفسیر کی کوئی جداگانہ منظم صورت نہ تھی۔ اس عہد میں دو تفسیروں کو کتابی صورت میں مدون کیا گیا۔ ان میں تفسیر ابن ابی کعبؓ اور تفسیر ابن عباسؓ قابل ذکر ہیں۔ ان تفاسیر کا پیشتر حصہ قرآن کے مفرد اور غریب الفاظ کی تشریح سے متعلق ہے۔ یہ تفاسیر لغوی، نثری اور قدرے فقہی ہیں ان میں اعتقادی مسائل یا اسرار کائنات کا ذکر نہیں۔ اس دور کا تفسیری اسلوب بھی بالکل سادہ ہے اور یہ ایک فطری امر تھا کیونکہ تدوین تفسیر کی یہ ابتدا تھی۔

اسلامی دعوت کے پھیلنے، رومیوں اور یونانیوں کے اختلاط، عجمی افکار کی شمولیت اور معاشرتی و سیاسی مسائل کے پیدا ہونے سے تفسیری ادب کو نیا رخ ملا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اسرائیلی اور نصرانی روایات کو بھی تفسیر میں بیان کیا جانے لگا۔ نت نئے مسائل سے اجتہاد کا دروازہ تو ضرور کھلا لیکن فکری اختلاف کا آغاز بھی ہو گیا۔ اگرچہ تابعین اور تبع تابعین نے کوشش کی کہ وہ صحابہ کرامؓ کے طریقے کی پیروی کرتے ہوئے بحث میں مناظرانہ رنگ نہ پیدا ہونے دیں۔ بہر حال بدلتے تقاضوں اور تفسیری مباحث کے ساتھ تفسیر قرآن کا یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ اور بقول ڈاکٹر محمد حسین ذہبی: "تفسیر تیسرے مرحلے پر پہنچ کر حدیث نبوی سے الگ ہو گئی اور اس نے ایک مستقل علم کا روپ اختیار کر لیا۔ قرآنی ترتیب کے مطابق ہر آیت کی تفسیر ہونے لگی اور یہیں سے تفسیری اسالیب و مناہج اور رجحانات تفسیری وسعت کا باعث بنے"۔[4]

قرآن کی تفسیر کے لیے دو زاویے مقرر کیے گئے ایک تفسیر بالروایت یا تفسیر ماثور اور دوسرا تفسیر بالرائے۔
تفسیر بالروایت سے مراد قرآن کی ایسی تفسیر ہے جس میں صرف احادیث نبوی، آثار صحابہ اور اقوال تابعین ہی پر انحصار کرتے ہوئے قرآنی احکام کی تشریح ہو سکتی ہے اور اس میں ذاتی فیصلے یا خیال کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن تفسیر کا یہ طریقہ بعض اہل علم کے نزدیک اس لیے اطمینان بخش نہیں کہ صحابہؓ کے دور میں ہی اکثر اہل کتاب حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے۔ اور انھوں نے جو روایات بیان کی تھیں ان کے غیر مستند ہونے کی وجہ سے روح قرآن متاثر ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ طبریؒ جیسے مشہور مفسر نے بھی اپنی زیادہ تر معلومات اہل کتاب ہی سے لی تھیں۔ پھر

قرآن کی تفسیر کے معاملے میں عہد حاضر کے تقاضوں کو بھلا کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود تدبر قرآن کی تلقین فرماتے اور غور و فکر کی دعوت دیتے تھے۔ اگر محض احادیث نبوی، اقوال صحابہ اور تابعین پر انحصار کرتے ہوئے قرآن کی تفسیر بیان کرنا مطلوب تھا تو پھر قرآنی تدبر کا کیا مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے؟ اسی لیے ابو الکلام آزاد لکھتے ہیں: ''تفسیر بالرائے کی مخالفت سے یہ مقصود نہ تھا کہ قرآن کے مطالب میں عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے حالانکہ قرآن اوّل سے آخر تک تعقل و تفکر کی دعوت ہے''۔[5]

تفسیر بالرائے سے مراد یہ ہے کہ قرآن کی آیات کی تفسیر حدیث نبوی، اقوال صحابہ اور تابعین کے احکام کی روشنی میں عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق کی جائے۔

تفسیر قرآن کے دونوں مکاتب فکر نے اپنے اپنے دائرے میں تفاسیر لکھیں اور تفسیر بالروایت اور تفسیر بالرائے دونوں کی روشنی میں ہزاروں تفاسیر لکھی گئیں بقول شاہ ولی اللہ: ایک جماعت صرف ان آثار کی روایت پر کمربستہ ہے جو آیات سے مناسبت رکھتی ہوں خواہ حدیث مرفوعہ ہوں یا موقوفہ یا کسی تابعی کا قول یا اسرائیلی روایت، ایک قوم فقہی مسائل کا احاطہ کرتی ہے ایک قرآن کی لغات کی تشریح کرتی ہے ایک علم معانی، علم بیان کے نکات کو تمام تر بیان کرتی ہے۔ کچھ آدمی علم سلوک کے راستے پر ہیں غرض تفسیر کا میدان نہایت وسیع ہے۔[6]

قرآن کے ہر پہلو کو انسانیت کے سامنے روشن کرنے کے لیے مسلمان اہل علم نے اپنے اپنے انداز میں کوششیں کیں۔ پاک و ہند میں سب سے پہلے عربی تفسیر ابوبکر اسحاق بن تاج الدین ابوالحسن نے جواہر القرآن کے نام سے لکھی دوسرا نام مولانا نظام الدین الحسن کا ہے۔ اس کے علاوہ بھی عربی تفاسیر لکھی گئیں لیکن ان کا دائرہ علما اور عربی دان طبقے تک محدود رہا۔ اس وقت مسلمانوں کی علمی و سرکاری زبان فارسی تھی اس لیے فارسی زبان میں بھی تفاسیر کی ضرورت محسوس کی گئی اور اعلیٰ پائے کی تفاسیر قلم بند کی گئیں۔ جس میں منہج الصادقین معروف تفسیر ہے۔[7]

اردو میں ترجمہ و تفاسیر کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ لیکن یہ سلسلہ چند سیپاروں اور سورتوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ شمالی ہند میں پہلی مقبول عام اردو تفسیر شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی تصنیف خدائی نعمت بہ معروف تفسیر مرادی ہے جو تین سو صفحات پر مشتمل ہے اور پارہ عم کی تفسیر ہے۔: ''تفسیر مرادیہ سے پہلے کوئی ایسی مفصل اردو تفسیر نہیں لکھی گئی تھی اس لیے اسے قرآن مجید کی پہلی اردو تفسیر کہنا چاہیے''۔[8] اس تفسیر کا انداز علمی نہیں بلکہ تبلیغی ہے لیکن نثر کی قدامت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ کام کی باتیں کیسی سلجھی ہوئی عبارت میں بیان کر دی گئی

ہیں۔[9] اس تفسیر کو نثری سرمایے کے اعتبار سے دبستان دہلی کی نثر پر فوقیت حاصل ہے کہ یہ تفسیر شاہ عبدالقادر کے موضح قرآن سے پہلے لکھی گئی تھی۔ سید ابوالخیر کشفی کہتے ہیں:

''ادبی طور پر یہ کتاب نہایت اہم ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ اسے جدید اردو نثر کا نقطہ آغاز سمجھتا ہوں۔ اس میں سادگی کے باوصف بڑی قوت ہے، باغ و بہار کے اسلوب کا حسن میر امن سے پہلے شاہ مراداللہ کی تفسیر میں نہایت حسن اور کمال سے ملتا ہے''۔[10]

شاہ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن مع حواشی اور حکیم محمد شریف کا تشریحی ترجمہ اردو تفاسیر کے ارتقائی سفر میں اہمیت کے حامل ہیں لیکن سر سید احمد خاں کی تفسیر بدلتے ہوئے حالات کی اہم ترین تفسیر کہی جا سکتی ہے۔ وہ اس لیے کہ سر سید نے انیسویں صدی کے فلسفے اور سائنس کی روشنی میں قرآن کے مفہوم کو عجب معنی پہنائے اور قرآن کے بعض مقامات کو بائبل کے قصص کی روشنی میں دیکھا ہے۔ معجزات کا انکار کیا اور صحیح معنوں میں مسلک اعتزال کو نئے لباس اور اضافوں کے ساتھ پیش کیا۔ اس تفسیر میں وہ روایات سے بغاوت کی آخری حد تک پہنچ گئے۔ اگرچہ بعض لوگوں کے خیال میں اسلوب کے اعتبار سے یہ نہایت مربوط اور منظّم تصنیف ہے اور اس میں مذہبی اور علمی اصطلاحات کی وہ بھرمار نہیں جو عام طور پر تفسیر کا خاصہ ہے۔[11]

سر سید کا دور عقلیت کا دور تھا، عقل و عرفان اور دین و دنیا میں شدید کش مکش جاری تھی۔ اس عہد کے تفسیری ادب میں اسی عہد کی فکری کش مکش اور افکار کی تائید اور تردید کے بارے میں بہت سارے خیالات ملتے ہیں۔ رشید احمد جالندھری لکھتے ہیں: ''ہر نئے مفسر کے لیے یہ معمول ہو گیا کہ وہ اپنے زمانے کے مروجہ مذہبی اور فلسفیانہ افکار کا سراغ قرآن ہی میں لگائے۔[12] سر سید نے جس مرعوبانہ ذہن کے ساتھ قرآن کی تفسیر لکھی اس کے اثرات بعد ازاں پرویز اور خلیفہ عبدالحکیم کے ہاں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کی تردید اسی سے متصل زمانے میں لکھی گئی تفسیر تفسیر حقانی میں ملتی ہے۔ اس تفسیر میں تقابل ادیان، عربی گرامر اور احادیث کے حوالوں کے ساتھ ساتھ فکر سر سید کے قابل اعتراض پہلوؤں پر بڑی عمدہ مباحث شامل ہیں۔ یہ تفسیر اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی انشائے مرصع کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ مخالفین کے شک و شبہات کو دور کرتے ہوئے اس کا اسلوب طنز آمیز تو ضرور ہے لیکن بقول مولوی عبدالحق: ''بلحاظ زبان و انداز و اسلوب سر سید کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے''۔[13] سید امیر علی کی تفسیر **مواہب الرحمٰن** کا اسلوب انتہائی

دقیق اور زبان پرانی ہے۔مولانا ثناءاللہ امرتسری کی تفسیر ثنائی کی مباحث کا دائرہ محدود اور مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر بیان القرآن کا انداز بیان بھی عربی فارسی الفاظ اور بکثرت اصطلاحات کے استعمال سے بوجھل ہو گیا ہے۔ فقہی اور کلامی مباحث، تصوف کے اسرار و رموز کے سبب یہ تفسیر جدید تعلیم یافتہ طبقے کی علمی ضروریات پوری کرنے سے قاصر رہی ہے۔عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر **تفسر ماجدی** کے ذریعے قرآنی اشکالات کو دور کرتے ہوئے قاری اور قرآن کے درمیان جاندار وسیلے کا کام دیا ہے۔[14]

عبدالماجد دریا آبادی ایک ادیب بھی تھے اس لیے **تفسیر ماجدی** میں عصری رجحانات کے ساتھ ساتھ ایک طاقت ور اسلوب نظر آتا ہے۔ان کی تفسیر خطیبانہ اطناب سے اجتناب اور حواشی کے اختصار دایجاز کی وجہ سے الگ شان رکھتی ہے۔[15] لیکن **تفسر ماجدی** میں فکری اعتبار سے **بیان القرآن** کا رنگ نظر آتا ہے۔اس لیے قرآن کے وسیع پیغام کو دل کش اسلوب کے باوجود یہ تفسیر عام کرنے میں ناکام رہی ہے۔ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن صفات الٰہیہ اور دین و مذہب کے وسیع تر مفہوم کو بیان کرتی تو ہے لیکن یہ تفسیر نامکمل ہے۔اگرچہ قرآن کے بنیادی تصورات کو پیش کرتے ہوئے قرآن کے طرز استدلال کو ہی ابوالکلام آزاد نے بنیاد بنایا ہے۔لیکن اس کے لیے جس انداز اور طرز تحریر کی ضرورت تھی۔وہ ترجمان القرآن میں نظر نہیں آتا حالانکہ ابوالکلام نے **ترجمان القرآن** کی زبان و بیان کو الہلال اور البلاغ کے معیار سے نیچے اتارا ہے۔[16] س کے باوجود **ترجمان القرآن** کا اسلوب دیرپا اثرات قائم نہیں کر سکا۔مولانا عبیداللہ سندھی کا انداز تحریر اُن کی تفسیر **المقام المحمود** میں ایسے کنجلک اور پریشان کن انداز میں سامنے آیا ہے کہ ان کی تفسیر سے استفادہ کرنا عام آدمی تو کیا کسی ادیب اور مفکر کے بس کی بات نہیں۔مولانا محمد شفیع کی تفسیر **معارف القرآن** اور پیر محمد کرم شاہ الازہری کی تفسیر ضیاء القرآن مخصوص منہاج کی نمائندہ ہیں۔البتہ امین احسن اصلاحی کی **تدبر قرآن** سنجیدہ اور علمی انداز میں قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کی ایک کوشش ہے، جس میں فقہی، جماعتی اور گروہ بندی سے بالاتر ہو کر قرآن کے پیغام کو دل نشیں انداز میں پیش کیا گیا ہے۔محمد الیاس اعظمی کے مطابق:

”یہ تفسیر اپنی اہمیت اور افادیت کے اعتبار سے ادب و انشا کا بہترین نمونہ ہے“۔[17]

اردو تفاسیر کے سرسری جائزے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر عالم دین، مفسر قرآن نے اپنے اپنے حالات، علمی رجحانات، بدلتے تقاضوں، عصر حاضر کی فکری ضروریات کے تحت پورے اخلاص و جانفشانی کے ساتھ

تفاسیر لکھی ہیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ کلامی تفاسیر میں اعتقادی بحثیں چھائی رہیں، فقہی تفاسیر میں اختلاف مذہب توجہ کا مرکز بن گئے۔ عارفانہ تفاسیر میں روحانی پہلو غالب آ گیا اور ادبی تفاسیر الفاظ کے حسن اور قرآن کے ادبی اعجاز کو موضوع بحث بنا سکیں۔ ان تفاسیر میں اگر کہیں قرآن کا پیغام ابھرا بھی تو وہ قرآن کے مرکزی موضوع کے مطابق اسلام کے ایک مکمل دین ہونے کا واضح نقشہ نہ مرتب کر سکا۔ اور اگر کسی نے ایسی کوشش کی بھی تو ایسی بھاری بھرکم مذہبی اصطلاحات اور عربی تراکیب والفاظ استعمال کیے کہ عام قاری یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ قرآن پاک کے پیغام کو سمجھنا اس کے بس کی بات نہیں یہ صرف علما کرام کی ذمہ داری ہے۔ مولانا معروف شاہ شیرازی لکھتے ہیں:

''ابوالکلام آزاد کی تفسیر جدید ذہن کو اپیل کرتی ہے لیکن ڈارون ازم اور ارتقا کے بارے میں تشریحات محل نظر ہیں۔ تفسیر ماجدی میں تصوف کے سلسلے میں مولانا اشرف علی تھانوی کا رنگ غالب ہے۔ تفسیر فراہی کا انداز عالمانہ اور فلسفیانہ ہے۔ امین احسن اصلاحی کا ترجمہ دل نشین ہے۔ لیکن بعض تاویلات کمزور ہیں۔''[۱۸]

ایسے وقت میں ضرورت تھی ایک ایسی تفسیر کی جو قرآن کے پیغام کی تفہیم اس طرح پر کرے کہ قرآن کے آفاقی پیغام کی معنویت ہر قاری پر اس انداز میں واضح ہو جائے کہ قرآن پوری انسانیت کے لیے بقعہ نور بن جائے۔ اس تفسیر میں جہاں عقائد وایمانیات کا ذکر ہو، وہاں عصری افکار وتحریکات کا تجزیہ بھی اور زبان اتنی آسان، سہل، سادہ اور دل نشین ہو کہ قاری کے وجدان وعقل دونوں مسحور ومسرور ہوں۔ قرآن اور عام پڑھے لکھے مسلمانوں کے درمیان زبان کی اجنبیت کی دیواریں گر جائیں اور قرآن غلافوں سے نکل کر سینوں سے ہوتا ہوا زندگی کے تمام گوشوں پر محیط ہو جائے۔ قرآن کے آفاقی پیغام کو عام کرنے کے لیے سید مودودی کی تفسیر قرآن تفہیم القرآن نے اردو کے تفسیری ادب میں اہم کردار ادا کیا۔

سید مودودی، اردو کے تفسیری ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود بھی ایک مدلل، ہمہ جہت، اور سہل انداز میں لکھی گئی تفسیر کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ جو نہ صرف مغربی افکار وتصورات اور فلسفیانہ توجیہات کو پورے اعتماد کے ساتھ ردّ کرے بلکہ نہایت آسان اور موثر اسلوب میں قرآنی احکامات کے مطابق، اسلام کے جامع نظام زندگی ہونے کا تصور بھی پیش کرے۔ انھوں نے اپنی اس تمنا کا اظہار ۱۶/اپریل ۱۹۲۶ء کو **الجمعیۃ** کے ایک اداریے میں یوں کیا ہے:

''ہمیں ترجمے سے زیادہ تفسیر کی ضرورت ہے۔ایسی تفسیر جو بلاغت کے نکات، ادب کے دقائق اور قصوں کی تشریح وتفصیل سے خالی ہواور جس میں تمام اعتراضات اور تعبیرات باطلہ کو پیش نظر رکھ کر قرآن مجید کے احکام اور تعلیمات کی تشریح کر دی جائے۔'' [۱۹]

۱۹۲۶ءہی میں جب سید مودودی اپنی اوّلین جامع تصنیف **الجہاد فی الاسلام** کی تخلیق کے لیے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کر رہے تھے۔تو مطالعہ قرآن کے دوران میں انھیں احساس ہوا کہ قرآن محض تلاوت کی کتاب نہیں بلکہ تحریک کی کتاب ہے۔اس لیے اس کو بنیاد بنا کر دنیا میں اسی طرح عالم گیر تحریک قائم کی جاسکتی ہے جیسے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی۔ [۲۰] گویا سید مودودی کے ذہن میں ۱۹۲۶ءکی یہ بات راسخ تھی کہ قرآن کی تفہیم کرتے ہوئے اس کتاب کو تحریک کی کتاب بنا کر ہی پیش کرنا ہے۔۱۹۴۰ء میں مولانا ابوالحسن ندوی نے جب مشاہیر کرام سے ''میری محسن کتابیں'' کے عنوان سے استفسار کیا تو سید مودودی نے قرآن کو ہی ''شاہ کلید'' قرار دیا کہ اسے جس قفل پر لگائیں فوراً کھل جاتا ہے۔حالانکہ سید مودودی اس وقت مغربی ومشرقی فلسفے اور دیگر علوم کی لائبریری اپنے دماغ میں اتار چکے تھے۔ [۲۱]

سید مودودی نے اگست ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کے نام سے جب اسلامی تحریک کی بنیاد رکھی تو اس تحریک کو فکری رہنمائی فراہم کرنے کے لیے تفسیر قرآن کی ضرورت اور زیادہ شدت سے محسوس ہوئی۔ چنانچہ سید مودودی نے فروری ۱۹۴۲ء میں ترجمان القرآن کے صفحات پر تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ بغیر کسی تعطل کے جاری رہا۔حالانکہ سید مودودی کو تحریک اسلامی کی عملی جدوجہد کے لیے چار مرتبہ (چار سال، سات ماہ، انیس دن کے لیے) جیل جانا پڑا۔ بیرون ملک کے دورے بھی کیے اندرون ملک تنظیمی امور سرانجام دینے کی ذمہ داری بھی آپ کی تھی۔سید مودودی کہتے ہیں:

''**تفہیم القرآن** لکھنے کا کام میں نے جماعت اسلامی کی تشکیل کے چند ماہ بعد شروع کر دیا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا جب میری زندگی کا سب سے طوفانی دور شروع ہوا یعنی ایک طرف مجھے علمی کام کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف جماعت کی تنظیم وتربیت کا مسئلہ درپیش تھا''۔ [۲۲]

سید مودودی نے جب تفسیر نگاری کا کام شروع کیا تو ان کے پیش نظر قرآن پاک کی مختصر تفسیر لکھنا تھا لیکن

جیسے جیسے قرآنی مضامین کی وضاحت شروع کی تو تفصیلات بڑھتی چلی گئیں اور یہ تفسیر چھے جلدوں میں مکمل ہوئی۔ پہلی جلد ۱۹۵۱ء میں جب کہ آخری ۱۹۷۲ء کو شائع ہوئی۔ پہلی جلد کی نسبت دوسری زیادہ مفصل ہے اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی اور چوتھی سے پانچویں اور پانچویں سے چھٹی بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پہلی جلد ساڑھے سات پاروں کی تفسیر ہے جب کہ آخری صرف دو پاروں اور ایک سورت کی تفسیر پر مشتمل ہے۔ سید مودودی کی تفسیر نگاری کا اصل رنگ تیسری جلد سے شروع ہوتا ہے۔ ان کی اس تفسیر میں وضاحت، صراحت، تفصیل اور جامعیت ہے جو تیسری جلد کے بعد اپنے کمال پر نظر آتی ہے اور ساتھ ہی نثر میں بھی سلاست، ادبیت، علمیت اور نکھرتی جاتی ہے۔ سید مودودی نے تفسیر لکھتے ہوئے پورے تفسیری ادب کو پیش نظر رکھا اور قدیم تفاسیر سے بھی استفادہ کیا ہے لیکن تفسیر لکھتے ہوئے ان کے پیش نظر ایک ہی مقصد تھا اور وہ بقول سید مودودی:

"میرے پیش نظر علما نہیں تھے ان کے لیے تفسیریں موجود ہیں۔ میرے پیش نظر نئی نسل تھی جسے قرآن کی دعوت سے روشناس کرانا میرا مقصد تھا"۔[۲۳]

سید مودودی نے جب تفسیر لکھنے کا کام شروع کیا تو اس وقت مغربی فلسفہ کے زیر پروان چڑھنے والی تہذیب اور تعلیم نے مسلمانوں کو علمی وفکری اعتبار سے منتشر کر رکھا تھا۔ یورپی سکالر جہالت کو تحقیق کا نام دے کر برعظیم میں رواج دے رہے تھے۔ الحاد فلسفہ کا روپ دھار چکا تھا، عریانی اور فحاشی آزادی نسواں قرار پا چکی تھی، بے حیائی اور بے پردگی جدت اور روشن خیالی تھی۔ اولاد قتل، ضبط ولادت اور سود معاشی ترقی کا درجہ حاصل کر چکے تھے اور مسلمانوں کی نوجوانوں نسل ان فتنوں سے مرعوب ہو کر اشتراکیت، قومیت، مغربی تہذیب، انکار حدیث جیسے فکری سیلاب میں بہہ رہی تھی۔ سید مودودی نے ان تمام افکار کی تہہ تک پہنچنے اور نوجوان نسل کے شک وشبہات دور کرنے کے لیے تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر ان افکار کا مطالعہ کیا۔ سید مودودی نے ویدوں کے تراجم، گیتا، ہندو مذہب اور اس کا فلسفہ تاریخ اور شاستروں کا نظر غائر سے جائزہ لیا۔ بدھ مت کی انگریزی میں ترجمہ شدہ کتابیں پڑھیں۔ بائبل اور پادری ڈومیلو کی تفسیر کی مدد سے عیسائیت اور یہودیت کے بارے میں وسیع معلومات حاصل کیں۔ تلمود کے ترجمہ شدہ حصوں کو بھی بغور پڑھا، دہریوں، ملحدوں، مادہ پرستوں کے فلسفے دیکھے اور مغربی مفکرین کے خیالات کے ساتھ ساتھ ان کی سوانح عمریوں کو بھی تجزیاتی بصیرت کے ساتھ پڑھا۔ پھر قرآن وسیرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ اسلام سے زیادہ معقول اور مدلل مذہب اور پیارے نبی حضرت محمد ﷺ سے زیادہ مکمل رہنما اور کوئی نہیں۔[۲۴]

سید مودودی کا تصور تفسیر بہت سادہ اور فکر انگیز ہے۔ قرآن کی تفسیر لکھتے ہوئے سب سے پہلے قرآن ہی سے رہنمائی لیتے ہیں پھر احادیث کی طرف رجوع کرتے ہیں، پھر اقوال صحابہ کو سامنے رکھتے ہیں۔ سید مودودی کا تصورِ تفسیر اور ان کے اصول تفسیر ان کے خطوط اور تفہیم القرآن کے صفحات پر بالکل نمایاں ہیں ایک خط میں لکھتے ہیں: ''قرآن مجید کی کسی آیت سے متعلق کوئی سوال پیدا ہو، تو خود قرآن سے اس کا مفہوم معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے بعد تحقیق کرنی چاہیے کہ آیا کوئی حدیث صحیح اس کی توضیح کرتی ہے۔[25] قرآن مجید کی تاویل و تعبیر کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں سید مودودی رقم طراز ہیں:

''قرآن مجید کی تاویل و تعبیر کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس آیت کے معنی سمجھنا چاہتے ہوں پہلے عربی زبان کے لحاظ سے اس کے الفاظ و تراکیب پر غور کریں۔ پھر اسے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھیں، پھر اسی مضمون سے تعلق رکھنے والی دوسری آیات جو قرآن میں مختلف مقامات پر موجود ہیں ان کو جمع کر کے دیکھیں''۔[26] سید مودودی قرآن کی تفسیر میں احادیث سے رہنمائی لیتے ہوئے بھی قرآن کے معنی کو ہی اہمیت دیتے ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں: قرآن کے خلاف کوئی روایت بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی''۔[27]

سید مودودی تفہیم القرآن میں قرآنی پیغام کی حدود کے اندر رہتے ہوئے تفسیر کرتے ہیں وہ قرآن کی تفہیم میں قرآن سے رہنمائی لینے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''ہمارے نزدیک قرآن کے الفاظ سے زائد کوئی مطلب لینا چار ہی صورتوں میں درست ہو سکتا ہے یا تو قرآن ہی کی عبارت میں اس کے لیے کوئی قرینہ موجود ہو، یا قرآن میں کسی دوسرے مقام پر اس کی طرف کوئی اشارہ ہو یا کسی صحیح حدیث میں اس اجمال کی شرح ملتی ہو۔ یا اس کا کوئی اور قابل اعتبار ماخذ ہو''۔[28]

ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر بالرائے کے مسلک کو اختیار کرنے کے باوجود سید مودودی قرآن کی تفسیر و تفہیم میں حد درجہ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور قرآنی الفاظ کو وہی مفہوم پہناتے ہیں جو اس سیاق و سباق میں قرآن کا مطلوب ہو سکتے ہیں یا جتنی اجازت قرآن کے الفاظ دیتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قرآن کی تفسیر میں میرا مسلک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں جس حد تک وسعت ہے میں اس کی حدود میں رہ کر اس کی تفسیر کرتا ہوں۔ ان حدود سے باہر جا کر اپنے تخیل سے کوئی ایسی بات حتی الامکان بیان نہیں کرتا جس کی گنجائش الفاظ قرآن میں نہ ہو''۔[29]

تیس سال کی محنت شاقہ کے بعد سید مودودی نے جو تفسیر تفہیم القرآن کے نام سے تیار کی ہے، وہ اپنے اندر بہت سی انفرادی خصوصیات رکھتی ہے۔ اردو کے تفسیری ادب میں یہ تفسیر کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور شہرت دوام پا گئی ہے۔ اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی تفسیر کا اعزاز تو اسے حاصل ہی ہے لیکن دنیا کی سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہونے کا مقام بھی اسی کو ملا ہے۔

سید مودودی نے ترجمان القرآن رسالہ جاری کیا تو ان کے پیش نظر مسلمانوں اور غیر مسلموں کو قرآن سمجھانے میں معاونت کرنا اور ان شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا تھا جو قرآن کے مطالعے کے دوران میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے تفہیم القرآن کو تھوڑا تھوڑا کر کے تسلسل کے ساتھ اس رسالے میں شائع کیا گیا۔ یوں تفہیم القرآن کو سب سے پہلے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ یہ تفسیر مسلسل تیس سال عام قارئین، اہل علم، اہلِ دین اور دانش ور حلقوں کے زیر مطالعہ رہی اور اس کا انتقادی بصیرت کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ سید مودودی نے اس ضمن میں ہونے والی تنقید کا نہ صرف خیر مقدم کیا، اور نظر ثانی کر کے کہیں کہیں تبدیلیاں بھی کیں، بلکہ اس سلسلے میں علما اور اہل دانش سے مراسلت بھی کی اور ان کی طرف سے اٹھائے جانے والے نکات کی روشنی میں اس تفسیر کو خوب سے خوب تر بنایا۔

تفہیم القرآن کی دوسری اہم خوبی اس کا جاندار، طویل اور بصیرت افروز مقدمہ ہے، جس میں سید مودودی نے مطالعہ قرآن کے دوران میں پیدا ہونے والے ممکنہ سوالات کے جوابات دیے ہیں۔ اور یہ واضح کیا ہے کہ قرآن عام کتاب کی طرح ایک کتاب نہیں ہے بلکہ اپنے موضوع، مضمون، اور ترتیب کے لحاظ سے ایک نرالی چیز ہے۔ لہٰذا قارئین کے ذہن کا وہ ''کتابی'' سانچہ جواب تک کتب بینی کی عادت سے بنا ہوا ہے، اس کتاب کو سمجھنے میں مدد نہ کرے گا بلکہ الٹا مزاحمت کرے گا۔ اس لیے سید مودودی لکھتے ہیں: ''اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسیات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خصوصیات سے روشنی حاصل کرو۔''[۳۰] سید مودودی نے اس مقدمے میں قرآن کے طرز بیان، اس کی ترتیب، کیفیت نزول، مضامین کی تکرار کے بارے میں بڑی بصیرت افروز باتیں لکھی ہیں۔ اور یہ باور کرایا ہے کہ یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بیک وقت نازل نہیں کی۔ بلکہ تحریک اسلامی کے مختلف ادوار میں حسب موقع اور حسب ضرورت اس کے مضامین اتارے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں کہ جسے آرام کرسی پر بیٹھ کر پڑھا جا سکے اور اس کی معنویت آشکار ہو جائے۔ اور نہ یہ عام تصور مذہب کے مطابق ایک مذہبی کتاب ہے بلکہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی

کتاب ہے۔اور اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی بلکہ ایک پیغمبر بھی معبوث فرمایا ہے جس نے قرآن کی روشنی میں وہ نظام برپا کیا جو قرآن کا مطلوب تھا۔[۳۱] اس مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سید مودودی جدید فکر سے متاثر اذہان کے اشکالات سے پوری طرح باخبر تھے اور ان کے پیش نظر انسانی الجھنیں بھی تھیں جو قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے پیش آتی ہیں یہ مقدمہ ان الجھنوں کے حل کا جواب اور ''قرآن فہمی کا دروازہ ہے''۔[۳۲] سید حامد عبدالرحمٰن الکاف لکھتے ہیں:

''اس تفسیر کا مقدمہ بذات خود قابل ستایش کارنامہ ہے جو نہ صرف بہت ساری علمی وفکری اور نفسیاتی رکاوٹوں کا ازالہ کرتا ہے جو قرآن فہمی کی راہ کو مسدود کرتی ہیں بلکہ ان رکاوٹوں اور مشکلات کو قابو پانے کے بعد یہ مقدمہ ناظر اور قاری کو اس کی تعلیمات کی طرف بلانے والا بھی ہے''۔[۳۳]

تفہیم القرآن کے مقدمے کی منفرد خصوصیت کے ساتھ ایک اور اجتہادی کارنامہ ہر سورۃ کا دیباچہ ہے جو قرآن فہمی میں آسانی پیدا کرتا ہے اور قاری کے سامنے وہ سارا ماحول، منظر، پس منظر پیش کر دیتا ہے جس میں وہ سورت نازل ہوئی۔قاری یہ دیباچے پڑھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اس ماحول کا حصہ ہے جس میں قرآن نازل ہو رہا ہے اور تحریک اسلامی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔سید مودودی نے ہر سورۃ کے آغاز میں سورۃ کا نام، نام کی مناسبت، وجہ تسمیہ، زمانہ نزول، شان نزول، اجزائے مضامین، مباحث کے موضوعات اور اہم نکات لکھ کر قاری اور قرآن میں ایسا گہرا ربط پیدا کیا ہے کہ قاری دوران مطالعہ کسی آیت کی معنویت سمجھنے میں ذرا بھی تذبذب کا شکار نہیں ہوتا۔سید مودودی نے یہ دیباچہ اس لیے رقم کیا ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ہر سورۃ کا پس منظر اور حالات نزول ،زمانی اعتبار سے بالکل مختلف تھے اس لیے ان کو سمجھے بغیر قرآن کو سمجھنا قدرے دشوار ہے۔

پروفیسر خورشید احمد رقم طراز ہیں:

''تفہیم القرآن میں شان نزول کے مواد کو بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔صاحب تفہیم کی کوشش ہے کہ قاری کے سامنے اس صورت حال اور کیفیت کو ایک حد تک تازہ کر دیں جس میں ایک سورۃ یا اس کے کچھ حصے نازل ہوئے۔یوں یہ تفسیر،قرآن کے تصورِ حیات کی تفسیر نہیں بلکہ اس میں تاریخ انبیا اور خصوصاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داعیانہ سیرت اور آپ کی قیادت وامامت میں کام کرنے والی اسلامی تحریک کی پوری تاریخ آ گئی ہے''[۳۴]

سید مودودی بعض اوقات سورۃ کی داخلی شہادت سے اس کے زمانہ نزول کا تعین کرتے ہیں۔ سورۃ الصّف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''کسی معتبر روایت سے اس کا زمانہ نزول معلوم نہ ہوسکا لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً جنگ احد کے متصل زمانہ میں نازل ہوئی۔ کیونکہ اس کے بین السطور جن حالات کی طرف اشارہ محسوس ہوتا ہے وہ اسی دور میں پائے جاتے تھے''۔[۳۵]

تفہیم القرآن کی ایک اور خوبی نظم قرآن کا نیا تصور ہے۔ سید مودودی نے قرآن کے مرکزی مضمون سے ہر سورۃ اور آیت کا ربط قائم کر کے دکھایا ہے لیکن نظم تشکیل میں اپنی بحث کو اصطلاحات کے استعمال سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ سید مودودی سے پہلے مفسرین کے ہاں نظم قرآن کا تصور تو ضرور ملتا ہے لیکن اس میں ایسی ہمہ گیری جامعیت اور وسعت نہیں کیونکہ مفسرین نے یا تو سورتوں کے باہمی ربط پر توجہ دی ہے یا آیات کے ربط کو متعین کیا ہے۔ مگر سید مودودی نے ہر سورۃ اور اس کے مضامین اور آیات کا ربط قرآن سے قائم کرتے ہوئے اسے چند مقدس و محترم شخصیات کے قصوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ قرآن کے مرکزی موضوع کو نمایاں کیا ہے۔ ان کا خیال ہے: ''اوّل سے آخر تک اس [قرآن] کے مختلف النوع موضوعات، اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں''۔[۳۶]

نظم قرآن اور موضوع قرآن میں ربط کے حوالے سے ڈاکٹر چارلس جے ایڈمز رقم طراز ہیں: ''سید مودودی کا مطمع نظر قرآن کی تفہیم کرنا تھا اس کے مرکزی موضوعات کی ایسے دل نشین اور جامع انداز میں وضاحت کہ انسانی زندگی پر اس کے دعوؤں کے متعلق کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے''۔[۳۷]

تفہیم القرآن کا ترجمہ کئی حیثیتوں سے منفرد ہے ایک تو اس ترجمے میں ترجمے کا نہیں ترجمانی کا انداز ہے، دوسرا یہ بہت سہل، شیریں اور قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنے والا ہے۔ پھر سید مودودی قرآن کے الفاظ کا ترجمہ اس کے سیاق وسباق میں کرتے ہوئے موزوں ترین الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ الطاف گوہر کے مطابق: ''تفہیم القرآن کا ترجمہ تحت اللفظ نہیں ہے۔ یہ تو تاریخی تناظر کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کے مفہوم کو آسان اردو زبان میں ڈھالنے کی ایک کامیاب کوشش ہے''۔[۳۸]

یہ تفہیم القرآن کا اعجاز ہے کہ اس میں ہمیں دین کا تصور پوری جامعیت کے ساتھ ملتا ہے۔ سید

مودودی نے دین کے کلی تصور کو پیش کرتے ہوئے دین کے اس مفہوم کے خلاف بغاوت کی ہے جس میں دین اسلام کو انفرادی زندگی اور مسجد و مسکن کی دنیا تک محدود کر دیا گیا تھا۔ تفہیم القرآن کے اوراق اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے، اور زندگی کے جملہ پہلوؤں میں اس کی حکمرانی کے ترجمان ہیں۔

سید مودودی نے دین کے تصور کو اس کی جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک زندگی ایک وحدت ہے اور اسلام اس وحدت کو عملی شکل دینے کے لیے آیا ہے۔ پروفیسر الیف الدین ترابی کے الفاظ میں: ''سید مودودی نے اپنی تفسیر میں ان پہلوؤں کو زیادہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق دعوتِ دین یا فریضۂ اقامت دین سے ہے''[۳۹] سید مودودی جامد مذہبیت کو ناپسند کرتے ہیں ان کے خیال میں دین اسلام اپنی ہیئتِ ترکیبی میں ایک متحرک دین ہے جو بدلتے ہوئے تقاضوں کا ہمیشہ ساتھ دیتا اور اپنے ماننے والوں کے لیے صراط مستقیم بنا رہے گا۔ اس لیے ان کے ہاں دین کا حرکی تصور ملتا ہے اور تفہیم القرآن اسی حرکی تصور کی تصویر بن گئی ہے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے بجا کہا ہے ''یہ تفسیر بیک وقت علمی بھی ہے دعوتی بھی اور تحریکی بھی۔''[۴۰]

اردو کے تفسیری ادب میں بعض مفسرین نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے مسلک کو ترجیح دی ہے اس لیے ان کی تفاسیر میں مسلکی رنگ ضرور ابھرا ہے۔ ایسے مفسرین نے کسی مسئلے کو اپنے مسلک کے مطابق ثابت کرنے کے لیے دلائل و براہین کے انبار لگا دیے ہیں اور بہت ساری تفاسیر کی شناخت ہی مسلکی تفسیر کے طور قائم ہے۔ مگر سید مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن میں ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی وہ اس لیے کہ ایک تو وہ فقہی معاملات میں تقلید جامد کے قائل نہیں دوسرا فقہا کی آرا ان کے نزدیک آخری سند نہیں ہیں۔ سید مودودی کی تفسیر میں مسلک کی چھاپ نہ ہونے کا تیسرا بڑا سبب یہ بھی ہے کہ وہ قرآن پاک کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے ہیں پھر احادیث اور اقوال صحابہ کو معیار بناتے ہیں۔ ان کی تفسیر میں یہ جملہ اکثر مقامات پر ملتا ہے۔ ''اس مضمون کو پوری طرح سمجھنے کے لیے قرآن پاک کے حسب ذیل مقامات کو نگاہ میں رکھیے'' گویا وہ قاری کے ذہن میں ہر وقت قرآن ہی کا چراغ روشن رکھتے ہیں۔ سید مودودی مسلکاً حنفی ہونے کے باوجود بعض اوقات حنفی مسلک سے بھی اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ قرآن کا مطالعہ تمام تعصّبات سے بالاتر ہو کر کرنا چاہیے۔ ایسے مقامات جہاں فقہا یا علمائے کرام کے درمیان اختلاف ہے، سید مودودی تمام آئمہ اور فقہا کی رائے درج کر کے خود پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور فیصلہ قاری پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اپنی عقل سلیم سے کس رائے کو ترجیح دیتا ہے۔ سید مودودی مقام اختلاف کی نشان دہی کرتے

ہوئے بڑے اعتدال اور توازن سے کام لیتے ہیں۔ یوں تفہیم القرآن کو اس اعتبار سے اوّلیت حاصل ہے کہ کسی خاص مسلک کی نمایندہ تفسیر نہیں البتہ قاری کو دوران مطالعہ فقہی مذاہب کے تقابلی مطالعے کا موقع ضرور ملتا رہتا ہے۔ تفہیم القرآن میں سید مودودی نے اپنی آرا کا بھی اظہار کیا ہے جو ان کی علمیت، معتدل مزاجی، استدلال اور حقیقت پسندی کی عکاس ہیں۔ ایسے معاملات میں سید مودودی ایک مخلص محقق کی طرح جس رائے کو قرآن وسنت کے قریب پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔ جوتے پہن کر نماز پڑھنے کے بارے میں ان کا خیال ہے:

''ان احادیث سے استدلال کر کے اگر کوئی شخص آج مسجدوں کے فرش پر جوتے لے جانا چاہیے تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ البتہ گھاس پر یا کھلے میدان میں جوتے پہنے پہنے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو میدان میں نماز جنازہ پڑھتے وقت بھی جوتے اتارنے پر اصرار کرتے ہیں وہ دراصل احکام سے ناواقف ہیں''۔[۴۱]

اس بحث سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سید مودودی نے فقہی احکامات سے متعلق صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا خلاصہ پیش کر دیا ہے کیونکہ یہ لوگ قرآن کے مخاطب اوّل تھے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے درست کہا ہے: ''سید مودودی نے فقہی مسلک سے بالاتر ہوکر قرآن کو قرآن ہی کی روح اور منشا کے مطابق سمجھنے کی جو سنجیدہ کوشش کی ہے وہ تفہیم القرآن کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔''[۴۲]

تفہیم القرآن کی ایک اور خصوصیت جو اسے باقی تفاسیر سے ممتاز کرتی ہے وہ یہودیت عیسائیت اور قرآن کا تقابلی مطالعہ ہے۔ ادیان کا یہ تقابلی جائزہ سید مودودی کی وسعت مطالعہ، باریک بینی، دقت نظری، تجزیاتی انداز اور تحقیقی رنگ میں سامنے آتا ہے۔ ادیان کے اس تقابلی مطالعے میں کہیں بھی مناظرہ بازی کی جھلک نظر نہیں آتی حالانکہ برعظیم میں اردو مفسرین نے جب عیسائی مشنری یا آریہ سماج کے حملوں کا جواب لکھا اور ان کے موقف کو اپنی تفاسیر میں رد کیا تو ان کے ہاں مناظرانہ رنگ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ مثلاً مولانا عبدالحق حقانی اور عبدالماجد دریا بادی کے ہاں ادیان سے متعلق مباحث تو ضرور ہیں لیکن ان کا انداز مناظرانہ ہے اور اس میں اختصار بھی ہے۔[۴۳]

سید مودودی کے ہاں یہ تقابلی مطالعہ کئی سطحیں رکھتا ہے ایک تو وہ مسیحی اہل قلم اور مغربی مستشرقین کے قرآن پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں۔ دوسرے قرآن اور بائبل میں موجود تضادات کو نمایاں کرتے ہیں کہ بائبل کی تعلیمات قابل اعتماد نہیں تیسرے زیر بحث مسئلے کے لیے دیگر مذاہب کی مقدس کتب، عیسائیت و یہودیت کے بارے میں لکھی گئی مذہبی کتب پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے قرآن کی روشنی میں اصل حقیقت واضح کرتے ہیں۔

چوتھے مغربی فلسفہ وافکار کے زیر اثر قرآن کی تفسیر اور تاویل کرنے والے مسلمانوں دانش وروں کا بھی محاکمہ کرتے ہیں۔ڈاکٹر چارلس جے ایڈمز نے اسی بنیاد پر کہا ہے: ''اس تقابلی مطالعے نے سید مودودی کی تفسیر کو جدید اقدار سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ان کا قدیم یا روایت پسند مفسرین کی تفاسیر سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا''۔[۴۴]

سید مودودی نے قرآنی تعلیمات سے موازنے کے لیے دیگر الہامی کتب کے حوالے نہ صرف برمحل استعمال کیے ہیں بلکہ جہاں جہاں ان کتابوں میں تحریف کی گئی ہے،اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔اور مضبوط دلائل کے ساتھ ان کتابوں اور ان کتابوں کی بنیاد پر قائم افکار و تصورات پر زبردست تنقید کی ہے۔ان تصورات میں یہودیوں کی نسل پرستی،عیسائیوں کا عقیدہ تثلیث،کفارہ اور مصلوبیت ایسے موضوعات ہیں جن میں تحقیقی معلومات ملتی ہیں۔

سید مودودی کا یہ تقابلی مطالعہ ان کی گہری علمیت،بصیرت اور تجزیاتی حس کی عکاسی کرتا ہے مولانا عامر عثمانی نے اسی تناظر میں لکھا ہے: ''تفہیم القرآن پڑھنے والا دیگر آسمانی کتب کے بعض ایسے مضامین سے آگاہ ہو جاتا ہے جن کی آگہی کسی اور ذریعے سے خاصی دشوار تھی''۔[۴۵]

سید مودودی تفسیر قرآن میں احادیث کو دوسرا بڑا ماخذ سمجھتے ہیں اس لیے تفہیم القرآن میں احادیث سے بھر پور استفادہ نظر آتا ہے۔پہلی دو جلدوں میں احادیث کی تعداد نسبتاً زیادہ ہے۔سید مودودی کہتے ہیں: ''میں نے جگہ جگہ قرآن مجید کی آیات اور احکام کی تشریح میں معتبر احادیث نقل کی ہیں جن سے حدیث و قرآن کا تعلق بھی اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے اور اس غلط فہمی کے لیے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی کہ حدیث کے بغیر بھی قرآن کو سمجھا جا سکتا ہے''۔[۴۶] بدقسمتی سے ہمارے تفسیری ادب میں بہت ساری اسرائیلی اور ضعیف روایات بھی شامل ہوگئی ہیں اور بعض روایات تو نقل ورنقل کی صورت قبول عام کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ان روایات سے استفادہ کی حمایت تو شاید ہی کسی مفسر نے کی ہو لیکن کم ہی مفسرین کا دامن اسرائیلیات سے پاک نظر آتا ہے۔علامہ یوسف القرضاوی کی رائے یہ ہے: ''ہمارے تفسیری ثقافتی ورثے کو جس چیز نے سب سے زیادہ داغ دار کیا وہ اس میں اسرائیلیات کا نفوذ ہے جس نے اس چشمہ صافی کو بہت کچھ گدلا کے رکھ دیا''۔[۴۷]

تفہیم القرآن میں اس ضمن میں ہمیں جو انفرادیت نظر آتی ہے وہ یہ کہ سید مودودی روایات کو جوں کا توں قبول نہیں کرتے بلکہ ان کا تجزیہ کرتے ہیں اور جو روایات قرآن کے مجموعی نظم اور تاثر سے ٹکراتی ہیں ان کو رد کر دیتے ہیں۔ان کے ہاں روایات کو قبول کرنے یا رڈ کرنے کا معیار صرف قرآن کا نفس مضمون ہے۔بہت سی ایسی

روایات جو قبول عام کے بعد بڑے بڑے مفسرین کی تفاسیر میں موجود ہیں، سید مودودی کے ہاں ان کا شمول نہیں، اگر کہیں حوالہ ہے بھی تو نقد احتساب کی بنیاد پر ہے۔ روایت سے متعلق سید مودودی کے ہاں یہ تجزیاتی انداز ان کی تفسیر کو قرآنی موضوعات اور حقائق کے زیادہ قریب کر دیتی ہے۔ وہ ایک خط میں لکھتے ہیں: ''عبداللہ بن ابی کے نماز جنازہ سے متعلق میں نے بخاری کی بجائے امام ابو جعفر طبری کی روایت کو سند کے ضعف کے باوجود قبول کیا ہے کیونکہ وہ قرآن سے متعارض نہیں ہے۔[48] تفہیم القرآن کی ایک اور انفرادیت نیا علم الکلام ہے لیکن یہ علم الکلام بھی اپنے اندر دو الگ الگ سطحیں رکھتا ہے اور یہ دونوں باہم مربوط بھی ہیں۔ سید مودودی سے پہلے تفاسیر میں کلامی مسائل پر مباحث ملتی ہیں لیکن ان مباحث میں کہیں تو اسلام کے بنیادی عقائد میں اشتباہ پیدا کیا گیا ہے کہیں مغربی فکر کے زیر اثر معجزات سے انکار ہے کہیں انداز اتنا فلسفیانہ و گھمبیر ہے کہ بات مزید الجھتی دکھائی دیتی ہے۔ سید مودودی اپنی تفسیر میں پہلے تو مغربی فلسفہ کے زیر اثر پروان چڑھنے والی فکر کی تردید کرتے ہیں اور اس فکر سے توحید، آخرت، معجزات اور نبوت میں پیدا کردہ اشکالات کی قرآن و سنت کی روشنی میں سائنسی استدلال کے ساتھ تردید کرتے ہیں۔ نبوت کے حوالے سے ان کا کہنا ہے: ''قرآن مجید کی رو سے یہ اسلام کے ان بنیادی عقائد میں سے ہے جس کے ماننے اور نہ ماننے پر کفر و ایمان کا انحصار ہے۔ ایک شخص نبی ہو اور آدمی اس کو نہ مانے تو کافر، اور وہ نبی نہ ہو اور آدمی اس کو مان لے تو کافر''[49]

سید مودودی نے علم الکلام میں جدت اور وسعت پیدا کرتے ہوئے عہد حاضر کے نظریات و افکار اور فتنوں کو بھی تفہیم القرآن میں تنقید و تحقیق کے پیمانے پر پرکھا ہے۔ مغربی فلسفے کے زیر اثر پروان چڑھنے والی مرعوبیت کو ختم کرنے کے لیے ان نظریات کا ابطال کیا ہے جو مسلم نوجوان کو شکوک و شبہات میں ڈالے ہوئے تھے۔ سید مودودی سے قبل یہ کوشش مسلم دانش وروں کے ہاں نظر آتی ہے لیکن ان کے ہاں وہ استدلال نہیں تھا جو جدید ذہن کو قائل کر سکے نہ وہ سلیس، سادہ اور قطعیت سے ترتیب پانے والا اسلوب تھا کہ بات دل میں اتر جائے۔ سید مودودی نے بڑے اعتماد کے ساتھ مغربی افکار ر د نظریات پر تنقید کی ہے اور دورِ جدید کے ہر چیلنج کا بڑے مثبت اور مدلل انداز میں جواب دیا ہے جو نہ صرف عقل سلیم کو متاثر کرتا ہے بلکہ اس کا منطقی ربط، مسلم نوجوان میں اعتماد پیدا کرتا ہے۔ اس دور میں اٹھنے والے فتنوں ڈارونیت، قومیت، سود، امپریلزم، بے پردگی کے بارے سید مودودی کی

الگ تصانیف بھی موجود ہیں لیکن ان کا بیشتر حصہ تفہیم القرآن میں تعلیمات قرآنی کے پس منظر میں زیادہ اعتماد استدلال اور بصیرت کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

تفہیم القرآن عہد حاضر کی وہ تفسیر ہے جس میں جہاں اسلامی عقائد، عبادات اور نظام زندگی کو پیش کیا ہے وہاں مغربی نظریات، تحریکات اور فلسفے کا محاکمہ کرتے ہوئے عہد حاضر کے ہر مسئلے کی حقیقت واضح کر دی ہے۔ خورشید احمد ندیم کے مطابق: ''دیگر تفاسیر کی نسبت تفہیم القرآن اپنے عہد کے مسائل سے زیادہ مربوط ہے اور اردو قارئین میں اسے جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کی کوئی نظیر نہیں''۔ ۵۰

حقیقت یہی ہے کہ تفہیم القرآن میں سید مودودی کی ساری فکر سمٹ آئی ہے۔ اس تفسیر میں فلسفہ، علم الکلام، تزکیہ، تصوف، تاریخ، سوانح، جغرافیہ، تقابل ادیان، علم الانسان، تمدن، قانون، فتنہ انکار حدیث اور قادیانیت جیسے موضوعات پر بڑی جامع فکر انگیز اور عالمانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن احسن نے ان ہی خصوصیات کی بنا پر لکھا ہے:

''تفہیم القرآن نے ہر فتنے اور گمراہی کا پوری استدلالی قوت کے ساتھ توڑ کیا ہے اور بے مثال ناقدانہ تجزیہ و تحلیل کے ذریعے اس کا تار و پود بکھیرا ہے اس طرح خود تفہیم القرآن عصر جدید کی نظریاتی اور فکری بنیادوں کے لیے ایک ایسا چیلنج بن گئی ہے جس کا کوئی مثبت جواب مغربی اور الحادی فلسفہ و فکر اور نام نہاد سائنسی تعقل کے پاس نہیں ہے۔'' ۵۱

سید مودودی نے تفہیم القرآن کی تخلیق میں جہاں جدت فکر کا ثبوت دیا ہے وہاں ان کے ہاں ایک اور امتیاز نظر آتا ہے اور وہ اس معاملے میں تمام مفسرین پر سبقت لے گئے ہیں۔ اور یہ امتیاز سفر نامہ ارض القرآن کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ قرآن مجید میں متعدد موضوعات ایسے ہیں جو گذشتہ اقوام کی تاریخ سے متعلق ہیں اور اسی نسبت سے ان مقامات کا ذکر ہے۔ سابق امتوں کے حالات، قیام گاہوں اور ان پر عذاب کے اثرات کی جزئیات قرآن ملتی ہیں۔ سید مودودی نے تفہیم القرآن کی تکمیل کے لیے ان مقامات تک خود جانے اور مشاہدے کرنے کی غرض سے ۳ نومبر ۱۹۵۹ء کو سعودی عرب اور شرق اوسط کا طویل سفر کیا، یہ سفر تین ماہ جاری رہا۔ سید مودودی نے اس سفر سے بہت ساری معلومات حاصل کیں اس لیے کہ مشاہدے کا کوئی بدل نہیں۔ انھوں نے ان مقامات کی نادر تصاویر، نایاب نقشہ جات بھی حاصل کیے اور انھیں تفسیر کا حصہ بنا دیا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ قاری کو واقعات کا پس منظر اور مقامات کا محل وقوع سمجھنے میں خاصی آسانی ہوگئی دوسرے بعض واقعات، مقامات اور تاریخ بنی اسرائیل کے متعلق مغربی مصنفین اور مستشرقین کے جھوٹے دعوؤں کا پول کھل گیا۔

سفر کے ذریعے حاصل شدہ معلومات اور نقشہ جات کی شمولیت سے تفہیم القرآن تمام تفاسیر پر سبقت لے گئی۔ نعیم صدیقی کے بقول: ''یہ نقشوں سے مزین پہلی تفسیر ہے۔''۵۲

تفہیم القرآن کی ایک اور منفرد خوبی قرآنی موضوعات اور مباحث کے مطابق حروف ابجد کی ترتیب کے ساتھ ہر جلد کے آخر میں موضوعات کا اشاریہ ہے۔اس سے نہ صرف تفہیم القرآن کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوا ہے بلکہ قاری کے لیے قرآن کے تمام موضوعات، مباحث، اور عنوانات تک رسائی نہایت آسان ہو گئی ہے اور اشاریے کی مدد سے کسی بھی موضوع پر نقطۂ نظر کو جاننا بھی سہل ہو گیا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد نے درست لکھا ہے: تفہیم القرآن کا جو اشاریہ تیار کیا گیا ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے یہ قرآن اور تفہیم کے تمام اہم مباحث کا آئینہ ہے''۔۵۳

اس تفسیر کی ایک اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ سید مودودی قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور اس کی انگلی پکڑ کر اسے فہم قرآن عطا کرتے ہیں۔ وہ محوِ مطالعہ قاری کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہیں اس لیے اکثر مقامات پر اس طرح کے جملے ملتے ہیں جو قاری کو شریک مطالعہ کرتے ہیں۔ مجھے یہ خوبی کسی اور تفسیر میں نظر نہیں آئی۔ تاہم اس تفسیر میں بعض مقامات پر آزاد ترجمانی کو اختیار کیا گیا ہے جو کہیں کہیں موضوع سے کامل ہم آہنگی نہیں رکھتی نیز حدیث اور فقہ پر مباحث میں بھی حوالہ جات اور ماخذ آت پر جس تحقیقی اپروچ کی ضرورت تھی وہ کم کم نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر تفہیم القرآن ایک منفرد تفسیر قرآن ہے۔

حوالے وحواشی

۱۔ جمیل نقوی: ''اردو تفاسیر''، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد،۱۹۹۲ء، ص۱۰

۲۔ مولانا محمد حنیف ندوی: مطالعہ قرآن، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۸۵ء،ص۲۶۹

۳۔ ڈاکٹر تحسین فراقی: عبد الماجد دریا بادی،احوال و آثار،ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور ۲۰۰۶ء، ص۵۷۶

۴۔ معارف اسلامی علی گڑھ ،ش۱،جنوری جون۲۰۰۳ء،ج۲،ص۱۹۔۲۰

۵۔ ترجمان القرآن لاہور،ج۔۱،ص۵۱

۶۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر فی اصول تفسیر ،قدیمی کتب خانہ کراچی،س۔ن،مترجم مولوی رشید احمد انصاری،ص۷۵

۷۔ جمیل نقوی:ص۱۸

۸۔ ڈاکٹرجمیل جالبی: تاریخ ادب اردو،دوم،مجلس ترقی ادب لاہور،۲۰۰۵ء،ص۱۰۴۴

۹۔ نجم الاسلام:نقوش لاہور سالنامہ شمارہ۱۰۵،ص۱۵۱۔۱۵۲

۱۰۔ فکر و نظر اسلام آباد،جنوری مارچ۱۹۹۹ء،ص۲۱۳

۱۱۔ ڈاکٹرمشتاق احمد: سر سید کی نثری خدمات،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۱۹۹۳ء،ص۱۰۱

۱۲۔ علم تفسیر اور مفسرین ،المکتبہ العلمیہ لاہور۱۹۷۱ء،ص۳

۱۳۔ ڈاکٹرسیدحمیدشطاری: قرآن مجید کے اردو تراجم و تفاسیر کا تنقیدی مطالعہ ،حیدرآباد س۔ن،ص۴۶۲

۱۴۔ ڈاکٹرتحسین فراقی:ص۶۳۴

۱۵۔ محمدعمرالصدیق دریابادی ندوی: قرآن مجید کی تفسریں ،مولانا آزاداکیڈمی علی گڑھ،۱۹۷۶ء،ص۳۴۹

۱۶۔ مولانااخلاق حسین قاسمی: ترجمان القرآن کا تحقیقی مطالعہ، مولانا آزاداکیڈمی نئی دہلی،۱۹۹۳ء، ص۴۸

۱۷۔ علوم القرآن علی گڑھ،امین احسن اصلاحی نمبر،ص۴۸۳

۱۸۔ سیارہ ڈائجسٹ لاہور قرآن نمبر،ص۱۵۴

۱۹۔ سیدمودودی:بانگ سحر ،ادارہ معارف اسلامی لاہور،۱۹۹۳ء، ص۱۳۸

۲۰۔ آئین لاہور،تفہیم القرآن نمبر،ص۱۱۵

۲۱۔ ایضاً،ص۱۱۸

۲۲۔ ترجمان القرآن لاہورانٹرویونمبر،اکتوبر۱۹۸۰ء،ص۴۳

۲۳۔ رفیق ڈوگر: مولانا مودودی سے ملاقاتیں ،دیدشنید پبلی کیشنز لاہور،۱۹۸۵ء،ص۱۲۳

۲۴۔ آئین تفہیم القرآن نمبر،ص۱۱۳

۲۵۔ مکاتیب زنداں ،چراغ راہ کراچی،۱۹۶۵ء،ص۱۲۰

۲۶۔ رسائل و مسائل ۔۳،اسلامک پبلی کیشنز لاہور،۲۰۰۰ء،ص۱۷

۲۷۔ تفہیم القرآن۔۳ ،ادارہ ترجمان القرآن لاہور،۱۹۶۹ء،ص۱۳،۱۷،حاشیہ۹۱

۲۸۔ ایضاً ۴،ص۳۳۴،حاشیہ۳۵

۲۹۔ مکاتیب سید ابو الاعلیٰ مودودی، دوم، اسلامک پبلی کیشنز لاہور۱۹۹۱ء،ص۲۷۶

۳۰۔ تفہیم القرآن۔ ۱،مکتبہ تعمیرانسانیت لاہور،۱۹۷۷ء،ص۱۶

۳۱۔ ایضاً،ص۳۳

۳۲۔ ابوالآفاق: سید مودودی سوانح، افکار، تحریک،اسلامک پبلی کیشنز لاہور۱۹۷۱ء،ص۲۹۱

۳۳۔ ڈاکٹر چارلس جے ایڈمز، تفہیم القرآن اور فی ظلال القرآن مشمولہ ابو الاعلیٰ مودودی، علمی و فکری مطالعہ، ادارہ معارف اسلامی لاہور،۲۰۰۶ء،ص۱۴۴

۳۴۔ آئین: تفہیم القرآن نمبر،ص۲۶

۳۵۔ تفہیم القرآن۔۵ادارہ ترجمان القرآن لاہور،۱۹۸۱ء،ص۴۵۲

۳۶۔ ایضاً،اص۲۰

۳۷۔ ''ابوالاعلیٰ مودودی اور تفہیم القرآن''مشمولہ: ابو الاعلیٰ مودودی علمی و فکری مطالعہ ،ص۱۹۷

۳۸۔ تذکرہ سید مودودی۔۲ادارہ معارف اسلامی لاہور،۱۹۹۶ء،ص۸۸

۳۹۔ ترجمان القرآن، مئی۲۰۰۴ء،ص۲۹۵

۴۰۔ ڈاکٹر خالد علوی: سید مودودی بحیثیت مفسر ،الفیصل لاہور،س۔ن،ص۷۷۔۷۹

۴۱۔ ایضاً۔۳،۸۹،حاشیہ۷

۴۲۔ ڈاکٹر خالد علوی:ص۳۴

۴۳۔ ایضاً،ص۵۶۔۵۷

۴۴۔ ڈاکٹر چارلس جے ایڈمز،حوالہ مذکور،ص۱۹۲

۴۵۔ تفہیم القرآن پر اعتراضات کی علمی کمزوریاں ،مکتبہ الحجاز کراچی،۲۰۰۱ء،ص۱۷۱

۴۶۔ آئین : تفہیم القرآن نمبر،ص۱۱۴

۴۷۔ ڈاکٹر محمد ہمایوں عباس شمس: کتب تفاسیر میں اسرائیلی روایات ہنگلت پبلشرز لاہور،۲۰۰۴ء،ص۲۲

۴۸۔ علی سفیان آفاقی: قائد تحریک اسلامی، سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور،۱۹۹۱ء،ص۹۰

۴۹۔ تفہیم القرآن۔۴،ادارہ ترجمان القرآن لاہور،۱۹۹۳ء،ص۱۵۱

۵۰۔ فکر و نظر اسلام آباد جنوری مارچ ۱۹۹۹ء،ص۳۲۹۔۳۳۰

۵۱۔ آئین: تفہیم القرآن نمبر۲،ص۵۷

۵۲۔ ایضاً؛ص۲۳۰

۵۳۔ ایضاً،ص۳۱